سرد دھوپ

اسرار ایوب

اسرار ایوب کی شاعری براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی

اسرار ایوب کا فن جمیل بھی ہے اور جلیل بھی۔ سید ضمیر جعفری

سرد دھوپ

اسرار ایوب





غالب برباد شدہ تمدن کی راکھ میں بھی زندگی کی چنگاریاں تلاش کر کے اُن سے امید کی شمعیں جگمگا لیتا تھا۔ اسرار ایوب، غالب نہیں مگر غالب کی طرح اکیلا ہے، تنہا ہے، آنے والے روشن دور کے خواب بننے والا اور ہم قنوطیت زدہ لوگوں کو آس دلانے والا شاعر ہے۔

اسرار ایوب کی شاعری میں، ادبیت کی دلربائی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔ بڑی بات یہ کہ اسرار ایوب کا اسلوب ہی ہے جو اسے اس قسم کا شاعر بنا دیتا ہے جس قسم کے دوسرے شاعر آج نہیں ہوتے

سید نصیر شاہ



Marasam
Publishers
ISLAMABAD 0300-5040433

سرد دھوپ

اسرار ایوب

سرد دھوپ

اسرار ایوب

مراسم پبلشرز
722 A, St. 7 Near Community Centre
Model Town (Humak)
Islamabad
0300-5040433

ضابطہ

نام کتاب	:	سرد دھوپ
مصنف	:	اسرار ایوب
سن اشاعت	:	2007
اہتمام	:	سید آلِ عمران
سرورق	:	آغا نثار
کمپوزنگ	:	ظہیر احمد، سید امداد علی
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	200روپے برطانیہ 5پاؤنڈ
پبلشرز	:	مراسم پبلشرز
پرنٹر	:	کاروان پریس لاہور

ISBN: 78 - 969 - 8531 - 05 - 8

انتساب

سید ضمیر جعفری

کے نام

جن کی اُنگلی تھام کر شہرِ سُخن میں چلنا سیکھا

ترتیب



بانسریوں میں لھو کے سُر

میں نے پانچ بار میر پور اور ایک بار مظفر آباد دیکھا ہے فردوس زارِ کشمیر سے میری حسی و بصری آشنائی اتنی ہے اور جتنا کچھ میں نے دیکھا ہے اس پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ گلستان نہیں دیوار گلستان ہے یہ باغ نہیں باغ کی باڑ ہے یہ رُوئے پر جمال نہیں نقاب سے چھنتی شعاعیں ہیں لیکن کتابوں میں، میں نے سارا کشمیر دیکھا ہے اس کی برف پوش چوٹیوں پر اپنے نقشِ پا ثبت کیے ہیں اس کے جھرنوں کے گیت سنے ہیں اس کے صندل و زعفران کے جھونکوں سے روح کو معطر کیا ہے اس کے رس بھرے پھل اور اس کے خشک میوے اس کے بلند و بالا درختوں کی چھاؤں میں کھائے ہیں میں نے غنی کاشمیری کے ساتھ اس کے مرغزاروں میں گلگشت کی ہے فیضی کے ساتھ اسکے بہشت آباد چشموں پر دربارِ عیش سجایا ہے اقبال کی معیت میں ''کوہ کے دامن میں وہ غمخانۂ دہقانِ پیر'' دیکھا اس سے ''بیدردیٔ ایام'' کی داستان سنی اور ''خدائے دیر گیر'' کے ''روزِ مکانات'' کو چیخ چیخ کر بُلایا ہے اور اب

اسرار ایوب کے ساتھ برف زاروں پر بکھری دھوپ کا سونا سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا ہوں۔ مٹھیاں بھرتا ہوں اور سونا پھسل پھسل جاتا ہے جس طرح میں نے کشمیر دیکھا اور محسوس کیا آپ نے شاید اس سے زیادہ یا شاید اس سے کم دیکھا اور محسوس کیا ہو لیکن ہم آپ سب اسے جنت نظیر اور ارضی فردوس کی حیثیت سے جانتے اور مانتے ہیں میں نے جب اسے دیکھا اور محسوس کیا تو فوراً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہاں ہر پھول ایک شعر، ہر جھرنا ایک گیت اور ہوا کا ہر جھونکا ایک بحر الاپتا ہے اور یہ سب مل کر سنگیت کمپوز کرتے ہیں اس لئے یہاں کا ہر آدمی شاعر ہوگا اقبال کو یہ قوم ''نجیب وتر دماغ'' اسی لئے محسوس ہوئی ہوگی۔ سوچیے کہ ہم آپ اپنے خیالوں میں ایک ڈریم لینڈ تخلیق کرتے ہیں یہ سرزمین ہماری رسائیوں میں نہیں ہوتی ایک خواب اور ایک تصور ہوتا ہے اسی کی ایک جھلک دیکھ پانے کی بیتاب تمنائیں ہمیں عمر بھر مبتلائے اضطراب رکھتی ہیں مگر یہ اہلِ کشمیر جو ہماری خوابوں کی سرزمین میں جنم لیتے اور زندگی بسر کرتے ہیں وہ اپنے خوابوں کا سفر کن کہکشاؤں سے شروع کرتے ہونگے کہ ہم جو مانگتے ہیں وہ سب کچھ انہیں حاصل ہے ہمارے خواب ان کے قدموں میں ہیں، ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے بے انتہا اونچے بہشت ان کا فرشِ راہ ہیں میں یہ سوچتا تو ساتھ ہی مجھے قوم ثمود یاد آجاتی جس پر عجیب قسم کا عذاب نازل ہوا تھا انکی زمینیں قسم قسم کے خوش رنگ پھولوں اور پھلوں والے درخت اگاتیں درختوں پر پھل آتے چاندنی ان پھلوں میں رس بھرتی لیکن جب ان محروم القسمت لوگوں کے بدنصیب ہاتھ ان پھلوں کی طرف بڑھتے تو پھل ریزہ ریزہ ہوکر زمین پر گر پڑتے بڑھے ہوئے ہاتھ سینہ کوبی کرنے لگتے اور للچائی ہوئی

نگائیں مایوسیوں کی شرر باریاں بن کر کاشانۂ چشم میں لوٹ آتیں بالکل یہی یہاں بھی ہو رہا ہے مگر یہ عذابِ خداوندی نہیں یہ جبر کے فرعونوں کا لایا ہوا عذاب ہے یہاں پھل ریزہ ریزہ نہیں ہوتے جابر انہیں مزے سے اتار لیتے ہیں اور حرماں نصیبی اس ''قوم نجیب و تر دماغ'' کے حصہ میں آتی ہے۔ یوں ان لوگوں کو بھی ''عرش سے پرواز کا آغاز'' نہیں کرنا ہوتا اپنے ہی پہاڑوں اپنے ہی برف زاروں اور اپنے ہی صنوبروں پر منڈلانا ہوتا ہے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں اور اگر فرق ہے تو یہی کہ ہم خواب دیکھتے ہیں یہ خوابوں کو ترستے ہیں انہیں خوابوں پر جھپٹ پڑنے کے لیے پر تولے بیٹھنا ہوتا ہے۔ ان ہی خوابوں پر جھپٹنے کی خاطر پر تول کر بیٹھنے والوں میں ایک شاعر اسرار ایوب بھی ہے۔

میں نے اسرار ایوب کی کتاب ''قرآن کا دکھ'' پڑھی تو مجھے اس سے زیادہ شناسائی نہیں تھی اور اب بھی بالمشافہ ملاقات تو صرف ایک ہی ہوئی ہے ''قرآن کا دکھ'' ایک حقیقت پسندانہ اور مفکرانہ کتاب ہے جس میں مصنف نے لوگوں کے ذہنوں پر پڑی ہوئی بے بصیرت ملائیت کی گرد صاف کر کے انہیں قرآنِ عظیم کی اصل تعلیمات سے روشناس کرانے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے اس کا اندازِ بیان اتنا دلکش اور پرتاثیر ہے کہ میں نے کتاب کے اندازِ تحریر کی سادگی و پُرکاری کے گردونواح میں مصنف کے اندر سفر کرتا ہوا شاعر دیکھ لیا تھا۔ یہ تو بہت عرصہ بعد معلوم ہوا کہ میری دریافت غلط نہیں تھی فون پر ہماری بہت سی ادھوری ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے اپنی شاعری کی اس کتاب کا مسودہ بھیجا اور خواہش کی کہ میں اس پر اپنی دیانتدارانہ رائے لکھ بھیجوں میں کوئی پیشہ ور تبصرہ نگار نہیں ہوں

میں نے لوگوں کی خواہش کے باوجود بہت کم ''پیش لفظ'' تحریر کیے ہیں اور یہ پیش لفظ بیشتر لوگوں کو پسند نہیں آئے اور جس طرح لوگ گھبرا کے آئینے توڑ دیا کرتے ہیں میری تحریریں بھی اپنی کتاب میں شامل کرنے کی بجائے پھاڑ ڈالی گئیں۔ بہت کم ایسے بہادر لوگ تھے جنہوں نے انہیں من وعن جزوکتاب بنایا۔

میں نے اسرار ایوب کی زیرِ نظر کتاب کا مسودہ کئی بار پڑھا ہے اور عدیم الفرصتی اور بڑھاپے کی بیماریوں اور نقاہت کے باوجود ایسا کیا ہے کیونکہ مجھے بہت سے اشعار نے اپنی طرف متوجہ رکھا ہے اور میری دلچسپی کو برابر مہمیز کیئے رکھا ہے۔

ادب کی متعلق میرا ایک خاص نقطۂ نظر ہے میں نے زندگی کو ترقّع پذیر اور ترقی پسند حوالوں سے سمجھا ہے اس لئے ''ادب برائے زندگی'' کے نظریہ سے وابستہ ہوں۔ تاہم یہ بھی کہتا ہوں کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے محض سپاٹ قسم کا پروپیگنڈا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اسرار ایوب کی شاعری میں اسی طرح کی بصیرت ملی ہے۔اس میں ''ادبیت'' کی دلربائی بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی، اردو میں سب سے بڑا شاعر غالب ہے اس نے بلا شبہ غزل کو مالا مال کر دیا ہے غالب کے بعد اقبال نے غزل کو عبادت بنانے کی کوشش شروع کر دی جو کچھ ایسی کامیاب نہ رہی فیض نے غالب کی ہی روایت کو آگے بڑھایا اور بہت خوبصورت غزلیں کہیں غزل کا عہد وسیع تر اور کامیاب ہوا، غزل کا سفر جاری ہے اچھے شاعر پیدا ہو رہے ہیں اچھی شاعری ہو رہی ہے مگر آج کے شاعر سے مجھے کچھ شکایات بھی ہیں آج کی غزل خوبصورت لفظوں کی کھوکھلی صنعت گری بنتی چلی جا رہی ہے لفظ بڑے خوشنما ہیں مگر بیشتر حالات میں مفہوم ناپید ہے دلربا الفاظ کی بندش بھی دلربا اور دلکشا ہے

تراش خراش میں بھی نادرہ کاری ہے پہلی نظر میں شعر کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے مگر ذرا سے غور سے عیاں ہونے لگتا ہے کہ ہیرا نقلی تھا مصنوعیت کی چھاپ واضح ہو جاتی ہے ایک خوش رنگ اور بڑی جسامت کے پیاز کی طرح، چھلکے اتارتے جاؤ، اتارتے جاؤ ہاتھ کچھ نہیں آئے گا میں یہاں مثالیں بھی پیش کر سکتا ہوں مگر یہ کام آپ پر چھوڑتا ہوں آپ اپنے عہد کی شاعری میں مفہوم تلاش کرنے بیٹھیں گے تو آپ کو میری تائید میں بے شمار مثالیں مل جائیں گی شاعری بلاشبہ تخیل کی کرشمہ سازی ہے لیکن بات کچھ بامفہوم ضرور ہونی چاہیے۔ ہمارے آج کے شاعر میں ایک اور چیز کی کمی ہے جسے انگریزی لٹریچر میں Wit کہا گیا ہے Wit یہ ہے کہ بارہا کی سوچی ہوئی چیزوں کو نئے سرے سے سوچا اور نئے روپ میں ''اظہار'' دیا جائے ہم بارہا کی سوچی ہوئی چیز کو پیش پا افتادہ حقائق سمجھ لیتے ہیں اور بیان کر دیتے ہیں خیر اس گہری فلسفیانہ بات کو چھوڑیے۔ مجھے آج کی شاعری سے یہ شکایت بھی ہے کہ آج کی ''لفظیات'' ایک ہیں سب ایک طرح کی ترکیبیں ایک طرح کے استعارے استعمال کر رہے ہیں اور صرف میں ہی نہیں آج کا ہر نقاد کہہ رہا ہے کہ آج اگر ایک رسالہ میں چھپی ہوئی بہت سی غزلوں پر سے نام مٹا دیں اور ایک ہی نام لکھ دیں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ ایک شاعر کی نہیں ہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو ایک چیز ہوتی ہے اسلوب وہ آج کے شاعر کے ہاں معدوم ہو رہا ہے۔

مجھے اسرار ایوب کی سادہ اور یسیر الفہم شاعری اس لئے بھی اچھی لگی کہ اس میں نابالغ قسم کا اظہار نہیں جو ابلاغ سے عاری ہو جاتا ہے اس میں تصنع آمیز لفظی جادوگری بھی نہیں اس میں بڑی حد تک Wit بھی ہے اور سب سے بڑی

بات یہ کہ اسرار ایوب کا اسلوب بھی ہے جو اسے اس قسم کا شاعر بنا دیتا ہے جس قسم کے دوسرے شاعر آج نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو بہت کم۔

کسی زمانہ میں صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں معاشرتی اور فکری سطح پر بھی زندگی '' جُوئے کم آب '' تھی مسائل بھی محدود تھے اس لئے علم بھی محدود تھا، شاعری بھی دیگر پیشوں کی طرح ایک پیشہ تھا، کوئی درزی بن گیا کوئی شاعر بن گیا کسی نے وقت کے فیشن کے مطابق کپڑے سیے کسی نے ماحول کے مطابق شاعری کی، کسی نے دھاگوں سے کپڑے کے زخموں کی بخیہ گری کی، کسی نے لفظوں سے دل کے زخموں کی بخیہ گری کی۔ ایک کا مقصد یہ ہوا کہ پہننے والا اپنے پہناوے کی تراش خراش اور سلائی کڑھائی سے خوش ہو، کسی نے کوشش کی کہ بادشاہ اس کے قصیدے سے یا سامع اور قاری اس کے شعر میں لفظوں کی صنعت گری سے متاثر ہو بادشاہ اپنی خوشامدانہ مدح سے خوش ہوتا اور عام سامع یا قاری عشق و عاشقی کے جذبوں کی ترجمانی سے مگر انگریز کے برتر تمدن کے آ جانے سے بوسیدہ تمدن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا لوگ اس ٹوٹ پھوٹ پر رونے لگے میر جیسے لوگ زندگی کی طرف پیٹھ کر کے محوِ گریہ وزاری ہوئے کچھ غالب جیسے وسیع الظرف اور روشن خیال لوگ تھے جنھوں نے برباد شدہ تمدن کی راکھ میں زندگی کی چنگاریاں تلاش کر لیں اور تخریب کے بعد تعمیر کی فکر میں لگ گئے یہاں سے نئی زندگی رونما ہوئی وسیع الجہات زندگی، کشادہ آفاق زندگی، علم کا آفتاب شعاعیں بکھیرنے لگا روشنی زمین کے آخری کناروں کو منوّر کرنے لگی یوں شاعری کو بھی نئے آفاق ملے نئی دنیائیں اور نئے جہان اس پر منکشف ہوئے غزل ان ادھر ادھر ہر طرف لکھی ہوئی سوچوں کی نقیب

تھی اس لئے اس نے بکھرتی، پھیلتی سحرِ بیکراں نئی زندگی کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی لفظیات وسیع المفاہیم ہوگئیں۔ عصری شاعری نے معانی کے اکہرے پن کو رد کر دیا یا ملتوی کر دیا شعر نے اپنے اندر بیک وقت یکساں طور پر کئی ایک سمتوں میں سفر کی ابتداء کر دی اسرار ایوب کا شعر بھی اسی سفر میں مسلسل گامزن ہے اس کا کمالِ فن یہ ہے کہ اس کے تخلیقی عمل میں تخلیق کار، تخلیق اور قاری ہم سفر ہو جاتے ہیں۔

اسرار ایوب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اسکا علامتی شعور اس کے تاریخی، سماجی اور فکری تجربوں سے ہم آہنگ ہو کر اس طرح شعر کے پیکر میں ڈھلتا ہے کہ بیک وقت بہت سی جہتیں لفظیات کی زبان سے ہمکلام ہونے لگتی ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی بحروں میں سموئے سادہ لفظوں میں جو علامتیں استعمال میں لاتا ہے وہ ماورائے لفظ بین السطور میں ہی قاری پر سخن کے بہت سے در وا کرتی ہے اور نیا جہانِ معنی منکشف کرتی چلی جاتی ہیں ہم اسے پڑھتے ہیں تو شعر کی سرشاری کے سفر میں گہری حیت اور جذبہ کی فراوانی میں اس کے ہم رکاب بننے کا شرف حاصل کر لیتے ہیں اسکی شاعری میں ابہام کی لطافتیں بھی ہیں مگر وہ کہیں بھی ہمیں ابہام کی بھول بھلیوں میں نہیں ڈالتیں کہ ہم بے انتہا ذہنی ورزش کی تھکن سے دو چار ہوں۔ اس کی لفظیات میں مقامیت کی خوشبو بھی ہے اور یہ خوشبو ہمیں مکان کے ''کون'' میں بھی رکھتی ہے اور لامکانیت کی وسعتوں میں بھی استطاعتِ بال کشائی دیتی ہے۔

اسرار ایوب نے کچھ نظمیں بھی شاملِ کتاب کی ہیں اور ان میں بھی اس کا اسلوب اور اس کا اپنا رنگ نمایاں ہے وہ رجائیت پسند ہے امید کا شاعر ہے ابھی ابھی میں نے غالب کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ برباد شدہ تمدن کی راکھ میں بھی زندگی

کی چنگاریاں تلاش کر کے ان سے امید کی شمعیں جگمگا لیتا تھا۔ اگر آپ پاکستان کے ایٹمی دھماکہ پر کہی ہوئی اسرار کی نظم پڑھیں تو آپ اسے اس دور میں منفرد سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے وہ غالب نہیں مگر اس کی طرح اکیلا ہے، تنہا ہے آنے والے روشن دور کے خواب بُننے والا اور ہم قنوطیت زدہ لوگوں کو آس دلانے والا۔ اس کے الغوزوں اور اس کی بانسریوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے ان سے لہو کے سر پھوٹ رہے ہیں اور ان میں اس کی اپنی رجائیت کی شیرینی بھی گھل رہی ہے۔ میں یہاں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں آپ کو اس اچنبھے میں چھوڑ کر کہ میں نے اتنا کچھ لکھ دیا مگر مثال میں اسرار ایوب کا ایک شعر بھی پیش نہیں کیا۔ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں وہ روایتی ''صاحب البیت'' نہیں بننا چاہتا جو مہمان کے سامنے کھانا لا کر رکھتا اور پہلے ہر ڈونگے سے دو چار نوالے کھا کر کہنے لگتا ''صاحب یہ قورمہ ہے بڑا لذیذ ہے، صاحب یہ مرغ پلاؤ ہے واہ واہ اس کے کیا کہنے، یہ متنجن ہے کھائیں گے تو مدت تک یاد رکھیں گے وغیرہ وغیرہ'' عام تبصرہ نگار یہی بے لطفی پیدا کرتے رہتے ہیں دو جملے لکھے اور چار پانچ شعر بطور مثال پیش کر دیئے اس طرح پوری کتاب سے گھوم گئے اس طرح کتاب کا سارا لطف غارت کر دیا اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ قارئین نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ کام کے اشعار بس یہی ہونگے جو تبصرہ نگار نے چھان پھٹک کر پیش کر دیئے دوسرا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ اصل کتاب کا لطف لینا چاہتے ہیں وہ تبصرہ پڑھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ میں آپ کے اور اسرار ایوب کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔۔۔۔اس لئے الوداع

سید نصیر شاہ (میانوالی)



مجھ پر مرے خدا کے انعام کی طرح ہیں
یہ برف بار بادل الہام کی طرح ہیں

جاڑے کی چاندنی میں تیرے خیال چُننے
ریشم کی شال بُننے کے کام کی طرح ہیں

اُجلی ہوئی رُتوں کی خوشبو سے ہیں معطّر
جھونکے صبا کے تیرے پیغام کی طرح ہیں

بادِبہار میں کب وہ خوش خرامیاں ہیں
کس گل کے رنگ میرے گل فام کی طرح ہیں

جنت میں چند دن جو آدم کے نام کے تھے
تیری گلی میں گزرے ایّام کی طرح ہیں

سب آر پار مجھ کو دکھتا ہے بیخودی میں
آنکھیں تمہاری شیشے کے جام کی طرح ہیں

نیلم کے پانیوں کی بھیگی ہوئی فضا میں
ہم لوگ شاردا کی اک شام کی طرح ہیں

جو رنگ منتشر ہیں پھولوں میں تتلیوں میں
یہ لفظ ٹوٹے پھوٹے اک نام کی طرح ہیں

قدروں میں ہے تغیّر ایسا کہ اُس نے مجھ میں
اوصاف جو گِنائے الزام کی طرح ہیں



مُلّائیت کی زد پر ہیں دُخترانِ حوّا
مظلوم آج یہ بھی اسلام کی طرح ہیں



سورج کُجا نحیف سا تارا نہیں ہوں میں
لیکن سیاہ رات سے ہارا نہیں ہوں میں

یہ غم نہیں کہ کوئی سہارا نہیں مرا
غم ہے کہ کیوں کسی کا سہارا نہیں ہوں میں

ہر لفظ میرا آج کے سورج کی ہے شعاع
کیا روشنی کا تازہ شمارہ نہیں ہوں میں

اب اُس سے بے رخی کی شکایت کا کیا جواز
پیارا ہے وہ مجھے اُسے پیارا نہیں ہوں میں

ہر وقت میں تراشتا رہتا ہوں راستے
اک موجِ تندخو ہوں کنارہ نہیں ہوں میں

کچھ اور بات تھی جو زبوں کر گئی مجھے
غم سے ترے تو معرکہ آرا نہیں ہوں میں

میں آدمی ہوں جس طرح ہوتے ہیں آدمی
لیکن بڑے بڑوں کو گوارا نہیں ہوں میں

مجھ سے گلہ تمہیں ہو بڑے دُکھ کی بات ہے
اب اور کس کا ہوں جو تمہارا نہیں ہوں میں



دہلیز تیری بھی نہیں اپنا بھی گھر نہیں
یہ کونسی جگہ ہے مجھے کچھ خبر نہیں

جنبش تو آئی ہاتھ میں، دستک نہ دے سکا
دروازہ یہ ضرور ہے پر تیرا در نہیں

ظاہر پرست آنکھ! کچھ ایسے بھی پیڑ ہیں
جن میں وجاہتیں تو ہیں لیکن ثمر نہیں

عرفانِ درد کا ابھی ان کو نہیں شعور
یہ لوگ اہلِ دل تو ہیں اہلِ نظر نہیں

خواہش ہے چاند نوچ کے کمرے میں ٹانک لیں
اس پر ہے یہ گلہ کہ دعا میں اثر نہیں

ہوں جستجو میں ایک ستمگر کی مبتلا
مجھ کو تری تلاش تو اے چارہ گر نہیں

برحق ہر ایک لفظ ہے الہام کی طرح
گو فرش پر کھڑا ہوں کسی عرش پر نہیں



ہمارے اپنے تو سب آس پاس رہتے ہیں
نجانے کس کے لئے ہم اُداس رہتے ہیں

کسی کی آنکھیں بھلی لگ گئیں انہیں شاید
کہ ان دنوں وہ بڑے خوش لباس رہتے ہیں

سُلگتی دھوپ سے ممکن ہے برفباری ہو
کہ موسم اب تو بڑے بدحواس رہتے ہیں

مرے مکاں سے کشادہ ہے قبر حاکم کی
جو خاص لوگ ہیں مر کر بھی خاص رہتے ہیں

جو تم گئے بھی تو تاریکیاں نہیں ہوں گی
کہ گھر میں ہم سے بھی روشن اساس رہتے ہیں

بھلا چھپائیں گے کس کس سے حالِ دل اسرار
بڑے بڑے یہاں چہرہ شناس رہتے ہیں





آہوں کی دو بانسریوں کا سینہ خالی ہو جائے
آ گاگر میں آگ بھریں اور چشمہ خالی ہو جائے

خالی ہاتھ گھروں کو آئے شام ہوا کی دستک ہو
جب بھی رُت کی تبدیلی سے قصبہ خالی ہو جائے

حیرت ہے وہ ساتھ نہیں لے جاتی کوئی شے پھر بھی
ایک پری وش کے جانے سے کمرہ خالی ہو جائے

لوٹ کے آئے ساحل سے ہم اور کہا ویرانی نے
دو ہنسوں کے اُڑ جانے سے ندیا خالی ہو جائے

لے جاؤ اسرار اُٹھا کر دن کے کاروبار کہیں
رات آئی ہے یاد کا اب تو رستہ خالی ہو جائے





خود سے بھی ہو گیا ہوں پرایا ترے بغیر
کتنا میں پڑ گیا ہوں اکیلا ترے بغیر

پت جھڑ تو کٹ گئی تھی ترے انتظار میں
موسم بہار کا نہیں کٹتا ترے بغیر

تیرے خیال و خواب کا موسم ہی کیوں نہ ہو
لگتا نہیں ہے کچھ مجھے اچھا ترے بغیر

کہتے ہیں یاد آتا ہے تنہائی میں خدا
مجھ کو تو کوئی یاد نہ آیا ترے بغیر

تو تھا تو مجھ کو سارے مراسم عزیز تھے
لگتا ہے جھوٹ ہر کوئی رشتہ ترے بغیر

تو کیا بچھڑ گیا کہ زمانہ بچھڑ گیا
سارا جہان ہو گیا تنہا ترے بغیر

حُسنِ بیاں فنا ہوا گونگی ہے شاعری
جیسے ہوں اپنی قبر کا کتبہ ترے بغیر



(اپنی شریکِ حیات نادیہ کے لیے)



اپنے قدموں سے جدا راہگزر کیسے ہو
ختم ہم خانہ بدوشوں کا سفر کیسے ہو

روز سورج تو ضیا بانٹنے آتا ہے مگر
جنکی بینائی نہ ہو اُنکی سحر کیسے ہو

سنگ دل کوئی ترے دل میں بسا ہی کب ہے
دردِدل کی تجھے ہو بھی تو خبر کیسے ہو

سانس رُک جاتی ہے جب یاد تری آتی ہے
زندگی تیری جدائی میں بسر کیسے ہو

ان کو اسراف نظر کا بھی گوارہ کب ہے
ہم پہ اسرار عنایت کی نظر کیسے ہو





ہیں ہوائیں نغمہ بر کس کے لئے
رقص کرتے ہیں شجر کس کے لئے

رنگ آوارہ ہیں کس کے واسطے
خوشبوئیں ہیں دربدر کس کے لئے

کیوں کہیں بھنوروں کو چین آتا نہیں
ہر کلی پر ہے نظر کس کے لئے

اے مری دیوانگی کچھ تو بتا
سر رکھا ہے ہاتھ پر کس کے لئے

از عدم تا کوچۂ شہر وجود
اتنا جاں لیوا سفر کس کے لئے

اے مرے دل اے مرے بے تاب دل
بے قراری اسقدر کس کے لئے

کون ہے پیچھے ہمارا منتظر
لوٹ تو جائیں مگر کس کے لئے

آرزو تک کی جگہ دل میں نہیں
حسرتیں آئیں اِدھر کس کے لئے



کوئی کلی کوئی تتلی نظر نہیں آئی
تمہارے بعد بہار اپنے گھر نہیں آئی

اگرچہ وقت نے سب واقعات دہرائے
وہ شام وصل کی بارِدگر نہیں آئی

پھر آج کوئی ٹہلتا رہا خیالوں میں
پھر آج نیند ہمیں رات بھر نہیں آئی

دعائیں خیر کی ہر وقت لب پہ رہتی ہیں
کئی دنوں سے تمہاری خبر نہیں آئی

بس ایک تیری ہی خاطر سجائی تھی محفل
بس ایک تو ہی مری جاں مگر نہیں آئی

ہوئی تھی شام تو اسرار شام سے پہلے
سحر کے بعد بھی لیکن سحر نہیں آئی





تخلیق کی گرہ میں سفر باندھنا پڑا
مضمونِ خوابِ راہگزر باندھنا پڑا

تنہا رہِ وفا میں کہاں تک کوئی چلے
پھر دل سے کوئی یادِ نگر باندھنا پڑا

آئے نہ آئے صبح مگر سوچنا تو ہے
شب کو خیالِ نورِ سحر باندھنا پڑا

چلنے لگا تو پاؤں سے دھرتی نکل گئی
مجھ کو گرہ میں دوستو گھر باندھنا پڑا

موجوں پہ ناؤ اپنی ذرا رقص کر سکے
پاؤں میں بادباں کے بھنور باندھنا پڑا

کتنے وفاشعار تھے جو راہ میں ملے
دل ایک بے وفا سے مگر باندھنا پڑا





جزا کے روز سے پہلے جزا کا کیا کرے کوئی
لحد کی ایک بے مقصد سزا کا کیا کرے کوئی

بچھی بل کھاتی پگڈنڈی پہ بارودی سرنگیں ہیں
پہاڑوں پر کسی کے نقشِ پا کا کیا کرے کوئی

جہاں دَیَودار کی تقدیر چھلنی گولیوں سے ہو
مہکتی چھاؤں کی ایسی جگہ کا کیا کرے کوئی

جہاں سے فاختہ کے پر لہو کا دُکھ پہن آئے
کسی ایسے مقامِ پُرفضا کا کیا کرے کوئی

جہاں کے زعفراں زاروں سے بُو بارود کی آئے
بھلا اس وادیٔ جنت نما کا کیا کرے کوئی

جہاں سورج نکلنے سے بھی تاریکی نہیں جاتی
مداوا رات کی اس انتہا کا کیا کرے کوئی

جو اپنے سب فرائض سے معطل ہو کے بیٹھا ہو
خدا وہ ہے تو پھر ایسے خدا کا کیا کرے کوئی

کتاب عشق کا اسرار دیباچہ وفا لیکن
وفا ناآشنا ہے وہ وفا کا کیا کرے کوئی





راکھ ہوئے سب وید پرت اور علم قلم معتوب ہوئے
نکتۂ تر کی سولی پر منصور کئی مصلوب ہوئے

آنکھوں کی بے نور گلی میں تاروں کو آواز نہ دی
دل کے گرتے حجرے کے کچھ درد بہت مجذوب ہوئے

شمسہ بری ہم راز بنی اک راولاکوٹ کے شاعر کی
اور قلم سے آب کے ویری ناگ بدن منسوب ہوئے

میں نے لکھی ہے آتی جاتی رُت کی رچنا دھرتی پر
برف مری تحریر ہوئی اور ابر مرے مکتوب ہوئے

جھیلیں میرا لہجہ ہوئیں دیَودار مری آواز بنے
اور مرے کشمیر کے روپ سروپ مرا اسلوب ہوئے

دنیا کیا کیا اپنے شجرے اور قبیلے رکھتی ہے
حیف ہمارے جیسے شاعر بس اسرار ایوّب ہوئے





دشتِ امکاں میں تنہا خدا رہ گیا
اُٹھ گئے ہم تو دنیا میں کیا رہ گیا

میری جانب نہیں گاگروں کا گزر
اپنا چشمہ بھرے کا بھرا رہ گیا

کوئی دریا بہا کب مری آنکھ سے
دل میں دُکھ کا ہمالہ جما رہ گیا

ایک خوشبو سی کہسار پر چھا گئی
گل بدن کا دریچہ کُھلا رہ گیا

جب چنبیلی نے مجھ کو معطّر کیا
دیر تک میں تجھے سوچتا رہ گیا

یونہی بے سمت اسرار چلتے رہے
بستیاں کھو گئیں راستہ رہ گیا





غیر مربوط ہر تسلسل ہے
جانے کیسا ہے سلسلہ میرا
ایک دستک کی دیر تھی اسرار
کٹ گیا مجھ سے رابطہ میرا





لہرائی ہے گھٹا کہ چلے ابر اور شراب
آ اب تو آ بھی جا کہ چلے ابر اور شراب

ہم لوگ تیرے وصل کو آئے ہیں شاردا
نیلم کنارے آ کہ چلے ابر اور شراب

اک عمر کٹ گئی ہے تجھے کھوجتے ہوئے
اب تو حجاب اُٹھا کہ چلے ابر اور شراب

ڈوبا ہے شہر بھاگتی گلیوں کے شور میں
اے شام رات لا کہ چلے ابر اور شراب

اچھا نہیں ہے دھوپ میں یہ شغلِ واشگاف
سورج ذرا بجھا کہ چلے ابر اور شراب

اُس نے کہا بدن کی قیامت تو دیکھیے
میں نے مگر کہا کہ چلے ابر اور شراب



الاپ

سات سُروں کے اوڑھ کے رنگ
تیری میٹھی یاد کے سنگ
میں اک سائیں مست ملنگ
دریا دریا۔ بہتے بہتے
اپنا قصہ۔ کہتے کہتے
اس جیون کی راہوں میں
اپنی سانسوں میں بہتی
اپنے خوابوں میں رہتی
مبہم منظر گاہوں میں
سات سروں کے اوڑھ کے رنگ
میں اک سائیں مست ملنگ

تیری میٹھی یاد کے سنگ
اتنی دور نکل جاؤں
اپنے ہاتھ بھی کب آ ؤں
میرے آگے میرے پیچھے
پیاس بھرے دو دریا ہوں
میرے آگے میرے پیچھے
ریت سے ریت سرکتی جائے
پیاس پہ دھوپ برستی جائے
آ گ بدن میں بستی جائے
سانس کی ناگن ڈستی جائے
میرے آگے میرے پیچھے
یہ اُجڑے ویرانے کیا ہیں
میں کیا جانوں جانے کیا ہیں
تیری میٹھی یاد کے سنگ
میں اک سائیں مست ملنگ

میرے ہمرہ تیرا چہرہ
جیسے صبحِ صادق کا ہو
ٹھنڈا میٹھا پیارا منظر
میرے ہمرہ تیری آنکھیں
جیسے برف بھرے پانی کی
اُجلی اُجلی نیلی جھیلیں
میرے ہمرہ چلتا جائے
یاد کا ایک شرابی بادل
جیسے تیرے کالے کاکل
تیز ہوا میں اڑتے جائیں
تیرے ہمرہ چلتا ہوں میں
سورج چاند ستارہ بن کر
بامِ فلک پر جلتا ہوں میں
تیری میٹھی یاد کے سنگ
میں اک سائیں مست ملنگ

میرے پاؤں کے بھی نیچے
نرم ملائم ریشم جیسے
مرغابی کی پر ہوتے ہیں
میرے آگے میرے پیچھے
دوشیزہ سے گھر ہوتے ہیں
میرے آگے میرے پیچھے
خوشبو کی تہذیب پہن کر
سبز سنہرے اُجلے آنچل
میرے آگے میرے پیچھے
قوسِ قزح کے سارے رنگ
تیری میٹھی یاد کے سنگ
میں اک سائیں مست ملنگ
رقص کروں اور تھک جاؤں
دور اک مدھم دیپ جلے
دھیرے دھیرے سانس چلے

نرم ہوا بھی رک رک جائے
وقت کا پرچم جھک جھک جائے
اور ملن کے دوراہے پر
آگ کا ایک سمندر ہو
تیر کے اس کو پار کروں
تیرے ہاتھ کا بوسہ لوں
اور امر ہو جاؤں میں
سات سُروں کے اوڑھ کے رنگ
تیری میٹھی یاد کے سنگ
میں اک سائیں مست ملنگ
میں اک سائیں مست ملنگ



اک اور شام کی نمی نگاہ میں ٹھہر گئی
اک اور رات جاگتے ہی جاگتے گزر گئی

کب اسکے نور سے مری نظر کی گاگریں بھریں
وہ رنگ روپ کی ندی تو بن چڑھے اتر گئی

بصارتیں نکھار کر بصیرتیں سنوار کر
وہ چاند اب گیا کہاں وہ چاندنی کدھر گئی

جو بحر میں اُتر گئی وہ آنسوؤں کی اک جھڑی
نجانے کتنی سیپیوں کو موتیوں سے بھر گئی

تمہارے غم کی لہلہاتی فصل دل کے کھیت میں
غمِ جہاں کی بارشوں سے اور بھی نکھر گئی

تمہارے ساتھ خوشگوار سی تھی زرد شام بھی
تمہارے بن کھلی سحر بھی سوگوار کر گئی





کوئی پُر بہار نہ رہ سکے ترے سوگوار کے سامنے
پڑی حوصلوں کی ہیں کرچیاں ترے انتظار کے سامنے

وہ سکوتِ صبح کی اوس ہو کہ خموش رات کی چاندنی
کوئی اک قرار نہ تھم سکے ترے بے قرار کے سامنے

تری راہ میں مرے شوق کو نئی منزلوں کی تلاش تھی
کبھی لالہ زار کے رو برو کبھی نوکِ خار کے سامنے

مرے کوزہ گر ترے چاک میں مری خاک جیسی بساط ہے
بھلا اختیار ہے کیا مرا ترے اختیار کے سامنے

ہے بڑی اُداس اکیلگی کسی اجنبی سے دیار میں
کوئی خوشگوار سی شام ہو کسی خوشگوار کے سامنے

میں انا کے عرش کو چھوڑ کر کبھی پستیوں میں نہ آؤں گا
تری رفعتیں سبھی ہیچ ہیں دلِ ذی وقار کے سامنے





ہر ایک صبح سے پہلے ہر ایک شام کے بعد
تمہارا نام ہی آیا تمہارے نام کے بعد

ہر ایک گام سے پہلے ہوا ہے یہ محسوس
کہ آنے والی ہے منزل بس ایک گام کے بعد

ہر ایک جام پہ ساقی نے یہ کہا ہم سے
کہ بھول جائے گا ہر غم بس ایک جام کے بعد

کہاں سے لائے کوئی حسن تیرے لہجے کا
کرے کلام کوئی کیا ترے کلام کے بعد

ترے سکوت سے دم آ گیا تھا ہونٹوں پر
کہ جان جان میں آئی ترے پیام کے بعد

ہر ایک راہ ترے در پر ختم ہوتی ہے
کوئی مقام نہیں ہے ترے مقام کے بعد

سحر کے جشن مناؤ مگر خیال رہے
کہ رات آئے گی پھر دن کے اختتام کے بعد



نامہ بر دیر سے آئے مگر آئے تو سہی
کوئی پیغام نہ لائے مگر آئے تو سہی

اب مجھے لمس کی خواہش نہ کسی قرب کی ہے
میری باہیں نہ سجائے مگر آئے تو سہی

بے نیازی ہی سے دیکھے وہ مگر دیکھے تو
خواب بھی میرے جلائے مگر آئے تو سہی

لمحہ بھر تو مری پت جھڑ میں وہ گل پوش رہے
چاہے پھر لوٹ ہی جائے مگر آئے تو سہی

کوئی اپنا بھی زمانہ کسی تقویم میں ہو
وقت کچھ ساتھ نہ لائے مگر آئے تو سہی

ابر کی دشت کے در پر کوئی دستک اسرار
برق ہی چاہے گرائے مگر آئے تو سہی





دن نکلتا ہے تو ہم رات پہ ہنس لیتے ہیں
راکھ ہوتے ہوئے جذبات پہ ہنس لیتے ہیں

صحن میں دیکھ کے پتھرائی خزاں کا منظر
موسمِ گل کے کمالات پہ ہنس لیتے ہیں

زیست کو جس نے بنا ڈالا لرزتا آنسو
اُس سے دم بھر کی ملاقات پہ ہنس لیتے ہیں

پوچھتے ہیں وہ سبب ہم سے ہمارے دُکھ کا
اور ہم انکے سوالات پہ ہنس لیتے ہیں

بھید زخموں کا نہ کھل جائے کہیں غیروں پر
آؤ اسرار کسی بات پہ ہنس لیتے ہیں





جب سے ترا جلوہ ہوا وا میری نظر میں
اک حشر سا رہتا ہے بپا میری نظر میں

میں دیکھ چکا موت کے اُس پار اُجالے
اتری ہی نہیں شام قضا میری نظر میں

ہر صبح کوئی تازہ تبسم مرے لب پر
ہر شام کوئی اشک نیا میری نظر میں

تقدیر سے بڑھ کر مجھے تدبیر کی دُھن ہے
دراصل ہے کوشش ہی دعا میری نظر میں

اک تیز سا نشتر جو تری آنکھ سے نکلا
ہر لمحہ وہ پیوست رہا میری نظر میں

کب تیرے سوا یاد کیا دل نے کسی کو
کب تیرے سوا کوئی بسا میری نظر میں

اس شہر کے لوگوں کے لب و چشم ہیں پتھر
یہ شہر ہے آسیب زدہ میری نظر میں

بجھنے نہیں دیتی کبھی تنہائی کی شمعیں
اسرار ابدزاد ہوا میری نظر میں





اچھے تھے کیا چنار کی وادی کے خدوخال
افسوس اب وہاں ہیں اُداسی کے خدوخال

مدھم بہت تھے صبح کی پہلی دعا کے وقت
بجھتے ہوئے چراغ میں بستی کے خدوخال

جیسے کیے ہیں جمع کسی نے ہوا کے نقش
بادل بدست پیرچناسی کے خدوخال

نیلم چٹانیں کاٹتا پھرتا ہے گھاٹ گھاٹ
شاید تراشے شاردا دیوی کے خدوخال

شب بھر انگیٹھیوں میں چٹختا ہے کس کا دل
کیا بولتے ہیں سوختہ لکڑی کے خدوخال

تہذیب یافتہ کسی چہرے کے نور میں
اسرار دیکھتا رہا دھرتی کے خدوخال



دُکھ کے سُر اور موتی

یہ نیلم جہلم کی لہریں
یہ سونے چاندی کی نہریں
دردیلی سُر میں روتی ہیں
اب برف میں بھی کب سوتی ہیں
یہ دھارے نور نظارے ہیں
یہ بوندیں موتی موتی ہیں
یہ اک کشمیر کہانی ہے
جو اس دریا میں بہتی ہے
یہ ہم سے بھی کچھ مانگتی ہے
یہ ہم سے بھی کچھ کہتی ہے



{اپنے محترم دوست میجر جنرل (ر) سرفراز اقبال کے لئے}

ایٹمی دھماکوں پر
امکان

ممکن ہے پربت سے آتے بادل راہ بدل جائیں
ممکن ہے کہ اپنے سائے اپنی دھوپ میں جل جائیں
صدیوں کی خاموش مسافت ایک گھڑی کے پیچھے ہو
شہر کی ساری نقل مکانی ایک جھڑی کے پیچھے ہو
جیون بھر کی پیاس اشکوں کی ایک لڑی کے پیچھے ہو
ہو سکتا ہے قہر کی دھوپ بھری ہو ٹھنڈی چھاؤں میں
ہو سکتا ہے موت کی ممتا پوشیدہ ہو ماؤں میں
ہو سکتا ہے مہلک زہر گھلا ہو صاف ہواؤں میں
ہو سکتا ہے آگ بھڑک اُٹھے گھنگور گھٹاؤں میں
ہو سکتا ہے ہو تیزاب کی بارش اپنے گاؤں میں

ممکن ہے نفرت کی آگ میں پیار کی منظر جل جائیں
ممکن ہے اَن دیکھے ہاتھ ہمارے پھول مسل جائیں
ممکن ہے اک اشک میں اپنے سات سمندر ڈھل جائیں
ممکن ہے ہو جائیں موم چٹانیں سنگ پگھل جائیں
ہر رستہ ہر قافلہ اک مرجھائی کلی کے پیچھے ہو
آدم کا ہر ایک سفر اک بند گلی کے پیچھے ہو
ممکن ہے کہ اپنا یہ اندیشہ بھی ناممکن ہو
ممکن ہے نفرت کی شب میں پیار کا قصہ ممکن ہو
ممکن ہے ظلمت کے دور میں نور کا چرچا ممکن ہو
ممکن ہے شاداب ہو دھرتی دشت میں دریا ممکن ہو
ممکن ہے تصویر میں گزرے وقت کا چہرہ ممکن ہو
ممکن ہے ادراک کے پنچھی صدیوں دور نکل جائیں
ممکن ہے جلتے صحرا میں سرد ہوائیں چل جائیں
ممکن ہے گرنے سے پہلے آدم زاد سنبھل جائیں



کل شب وہ مہ جمال لبِ بام آ گیا
بحرِ دل ونگاہ میں کہرام آ گیا

آنکھیں کسی کی جلوہ گری سے الجھ گئیں
دل دوستو ہمارا تہہِ دام آ گیا

اے رہروِ شعور قدم اپنے روک لے
اُس کی گلی ہے کوچۂ الہام آ گیا

اکثر تجھے بھلاتے ہوئے دن ہوا تمام
اکثر ترا خیال سرِشام آ گیا

مہکی تھی جب زمین بنفشہ کے قرب سے
کچھ بات تھی کہ لب پہ ترا نام آ گیا

آنے لگا تھا آج وہ اسرار کی طرف
پھر یاد شاید اس کو کوئی کام آ گیا





ترے شوخ آنچل سے اے میری جاں
مہکتے ہیں کشمیر کے زعفراں

ملے اب بھی نیلم سے جہلم وہیں
کسی روز بچھڑے تھے ہم تم جہاں

کہاں سے تُو اے زرد رُت آ گئی
کہاں جا بسیں اپنی گلی پوشیاں

جہاں بانسری کی نوا رُک گئی
وہیں تھم گئی گردشِ دوجہاں

چلو آؤ اسرار سُننے چلیں
ہوا سے درختوں کی سرگوشیاں





جس کے لئے کٹتی ہے مری شب بھی سحر بھی
کیا ہو گی کسی روز اُسے میری خبر بھی

اے کاش جسے کان ملے سُن بھی سکے وہ
جسکو ملی آنکھیں اسے مل جائے نظر بھی

جو لوگ مرے ساتھ رہے تیرہ شبی میں
کرتے مرے ہمراہ اجالوں کا سفر بھی

ہلکا سا گماں بھی ترے آنے کا اگر ہو
تو ہی نظر آتا ہے میں تکتا ہوں جدھر بھی

در بند نہ کرنا کبھی ویرانۂ جاں کا
آئے گا یقیناً کوئی گل پوش ادھر بھی





تری کھنکتی ہوئی یاد لہلہائی تھی
ہوا کی چوڑیاں تھیں شاخ کی کلائی تھی

میں دیکھتا تھا جدھر تو دکھائی دیتا تھا
یہ بندگی تھی مری یا تری خدائی تھی

جہاں جہاں تجھے تقدیر کا خیال آیا
وہاں وہاں مری تدبیر مسکرائی تھی

کسی کے سامنے بے بس تھا دھڑکنوں کا چلن
دیارِدل میں کسی کی عجب رسائی تھی

نہ آنے والے سے بس اتنا پوچھنا تھا مجھے
کہ اس نے آنے کی اُمیّد کیوں دلائی تھی

جو اُس کے قرب میں کچھ پل بسر کیے اسرار
تمام عمر کی اپنی یہی کمائی تھی





گر نہ تجھ سے ہمیں نسبت ہوتی
اپنی کس بات کی شہرت ہوتی

آنکھ میں حسنِ نظر جو ہوتا
پھول کی دید عبادت ہوتی

جس طرح تیری ضرورت ہے مجھے
تجھ کو بھی میری ضرورت ہوتی

تُو اگر بھول نہ جاتا ہم کو
کیوں تری یاد سے وحشت ہوتی

اپنے ہونے سے جہاں ہے اپنا
ہم نہ ہوتے تو قیامت ہوتی

اور ہے کون ہمارا اسرار
اور کِس کی ہمیں چاہت ہوتی





ہے بہار اپنی منتظر اسرار
زرد پتوں سے اک ذرا آگے





لوری

میری کیسر کیاری بٹیا
میری پھول پٹاری بٹیا
سو جا پیاری پیاری بٹیا
سبز سنہری یادیں پیچھے
رنگ برنگے سپنے آگے
اپنا جیون تتلی بن کر
تیرے آگے پیچھے بھاگے
شام تری پلکوں میں سوئے
صبح تری آنکھوں میں جاگے
تیرے چہرے سے کھلتے ہیں
سب نظّارے پیارے پیارے
سبز دنوں کا ایک اک تیور

قوسِ قزح کے جلوے سارے
تیری چاہت کے موسم ہیں
بٹیا اب دن رات ہمارے
امّاں کے تو دل کی دھڑکن
ابا کی آنکھوں کا تارا
تیرے دم سے قائم دائم
سب کا سب سنسار ہمارا
تجھ میں جان ہماری بٹیا
میری راج دلاری بٹیا
سو جا پیاری پیاری بٹیا



(اپنی بیٹی میرب کے لیے)



جدا تھا تجھ سے توقع میں تجھ کو پانے کی
کہ آرزو تھی تجھے روٹھ کر منانے کی

رہی زمانے کو حسرت مجھے رُلانے کی
کہ مجھ کو غم میں بھی عادت ہے مسکرانے کی

انا پرست ہوں دشمن یہ جانتے ہی نہیں
کہ خود گریں گے وہ ضد میں مجھے گرانے کی

ہو وقت جیسا بھی آخر گزر ہی جاتا ہے
بدلتی رہتی ہے آب و ہوا زمانے کی

مجھے تو سانس بھی آتی ہے تیری یاد کے ساتھ
کہ مار ڈالے گی کوشش تجھے بھلانے کی

دل و نگاہ تری راہ میں بچھا دیتا
مجھے خبر ہی نہ ہو پائی تیرے آنے کی

وہ دیر کرتا ہے آنے میں ایک تو اسرار
پھر اُس پہ جلدی بھی رہتی ہے اُسکو جانے کی





پتہ رقیب سے کرتا ہوں تیرے حال کا بھی
کوئی جواب نہیں میرے اس سوال کا بھی

یہ کس مقام پہ لے آئیں چاہتیں تیری
دکھائی دیتا ہے پیکر ترے خیال کا بھی

میں تجھ کو پا کے بھی گم ہوں تری تمنا میں
فراق سا ہے زمانہ ترے وصال کا بھی

پگھلتا ہوں تو چمکتا ہوں شمع کی مانند
بلندپایہ ہے عالم مرے زوال کا بھی

یہ اس کے قرب کا مجھ پر ہوا اثر اسرار
کہ عام لگتا ہے اب آدمی کمال کا بھی





زمین پاؤں تلے ہو تو آسماں کیا ہے
مکاں ہو راحتِ جاں کا تو لامکاں کیا ہے

نہ بارشوں سے نہ ہی دھوپ سے تحفظ دے
سروں پہ نیلا سا بیکار سائباں کیا ہے

نگاہِ ناز کی ذرّہ نوازیوں کے بغیر
علاجِ گردشِ دوراں اے مہرباں کیا ہے

جہاں بہشتِ بریں سے بھی چاہے پیارا ہو
جو تم جہاں میں نہیں ہو تو یہ جہاں کیا ہے

ابھی تو ایک قیامت ملی ہے ذرّے میں
نہ جانے اور ابھی خاک میں نہاں کیا ہے

گراں ہے زیست تو کچھ موت بھی نہیں آساں
ترے وصال کی حسرت بھی میری جاں کیا ہے

لہو تو چشمِ تمنا سے بہہ گیا اسرار
نجانے میرے رگ و پے میں اب رواں کیا ہے





فنا ضروری ہے انسان کی بقا کے لئے
نہ زندگی کی دعا دو مجھے خدا کے لئے

رکھا ہے خود پہ بھروسہ دُکھوں کے ریلے میں
یہ ایک سُکھ بھی بہت ہے مری انا کے لئے

بھنور میں چھوڑ کے پتوار اپنی کشتی کی
اٹھاؤں ہاتھ بھلا کس طرح دعا کے لئے

وہ آئے یا نہیں آئے یہ اُسکی مرضی ہے
دریچہ اپنا کھلا ہے مگر صبا کے لیے

سدا بہار سہی ہوں تو راستے کا شجر
وہ میری چھاؤں میں ٹھہرے گا کب سدا کے لئے

مرا سفر ہی تو اسرار میری منزل ہے
میں ابتدا کے لئے ہوں نہ انتہا کے لئے





دیکھنا آنکھ نم نہ ہو جائے
غم کہیں اپنا کم نہ ہو جائے

راستوں کی کتاب کُھلنے سے
پیڑ کوئی قلم نہ ہو جائے

دیکھ بالشتیوں کی بستی ہے
اپنی گردن بھی خم نہ ہو جائے

اتنا اثبات اپنا ٹھیک نہیں
اس کا ہونا عدم نہ ہو جائے

کاروبارِ حیات سے بھی کہیں
یاد تیری اہم نہ ہو جائے

ڈستے پھرتے ہیں آدمی اسرار
سانپ بھی محترم نہ ہو جائے





تیرگی سے بھی اُجالوں کی توقع اسرار
ہم سا خوش فہم نہیں کوئی کہیں بھی شاید





عمیق بحر تو میرا ہی استعارہ ہے
کسی نے پھر مجھے پاتال سے پکارا ہے

یہ ایک جاں تو کئی بار اُس کو سونپی ہے
یہ ایک دل تو کئی بار اُس پہ وارا ہے

نجانے کونسی منزل کی ہے تلاش ہمیں
کہ ہمسفر سے الگ راستہ ہمارا ہے

بہار میں بھی کہاں چھو سکا ہوں پھولوں کو
وصالِ یار میں عہد ستم گزارا ہے

وہ آشنا ہے تو ملتا نہیں ہے کیوں اسرار
وہ اجنبی ہے تو کیوں زندگی سے پیارا ہے





خود سے بچھڑے ہوئے نہیں ہوتے
کاش تجھ سے ملے نہیں ہوتے

کس کو خوشبو بھلی نہیں لگتی
پھول پیارے کسے نہیں ہوتے

انکی خاطر ہیں مہرومہ روشن
جن کے گھر میں دیے نہیں ہوتے

زرد رُت کے کرم ضروری ہیں
ورنہ گلشن ہرے نہیں ہوتے

تُو کسی کا بھی ہو تری مرضی
ہم کسی اور کے نہیں ہوتے

کیوں ہے ایسا کہ جس طرح ہم ہیں
اس طرح دوسرے نہیں ہوتے

لُٹ گیا غم کا بانکپن اسرار
کاش آنسو گرے نہیں ہوتے





بس گیا غیر تیری محفل میں
تیر پیوست ہو گیا دل میں

ایک کم سن کو دے کے دل اپنا
پڑ گیا ہوں میں سخت مشکل میں

قتل کرتا ہے مہرباں ہو کر
یہ ادا بھی ہے میرے قاتل میں

تو اگر راستے میں چھوڑ گیا
لطف ہی کیا رہے گا منزل میں

سب ہی اچھے دنوں کے ساتھی تھے
کام آیا نہ کوئی مشکل میں

آؤ پھر ڈھونڈھتے ہیں وہ بچپن
کھو گیا تھا جو ریگِ ساحل میں





زیست سے جب گلہ رہا مجھ کو
خوف کیوں موت کا رہا مجھ کو

کس طرح تجھ کو دیکھ پاؤنگا
تو اگر دیکھتا رہا مجھ کو

میں تجھے بھول کے رہوں زندہ
یہ بھی کیا سُوجھتا رہا مجھ کو

آج پھر نیند تیرے پاس رہی
آج پھر رتجگا رہا مجھ کو

کتنا بے بس ہوں تیرے آگے میں
بس یہی حوصلہ رہا مجھ کو

اُس کی آنکھوں سے پڑھ لیا میں نے
رات بھر سوچتا رہا مجھ کو

غم نے کتنا بدل دیا اسرار
مجھ سے وہ پوچھتا رہا مجھ کو





اشکوں میں اتر کر مری پلکوں پہ کھڑی ہے
اک عمر سمجھتے ہیں جسے ایک گھڑی ہے

ہر ظلم ہے ظالم کو سہولت سے میسّر
مظلوم پہ انصاف کی ہر شرط کڑی ہے

ہر راہ ترے شہر کی آسیب زدہ ہے
ہر سنگ پہ وحشی سی کوئی آنکھ جڑی ہے

یہ ابر ہیں کیسے جو افق پر ہوئے قابض
ہر لمحہ شرربار ہے جو کیسی جھڑی ہے

کوئی بھی تہہِ دل سے نہیں ہے مرا غم خوار
کہنے کو تو دنیا مری ہمدرد بڑی ہے

کانٹوں پہ بھی پھولوں کا گماں ہونے لگا ہے
جب سے مجھے عادت تری چاہت کی پڑی ہے





خلقتِ شہر مرے سر کی طلبگار سہی
پہلوئے یار نہیں سایۂ تلوار سہی

دل کو عادت تو بہرطور ہے جل جانے کی
آتشِ گل نہ سہی شعلۂ رخسار سہی

وقت کے بام سے اُبھرے گا کبھی صبح کا نور
ان منڈیروں پہ ابھی رات کی یلغار سہی

انتہا کا ہے ارادہ تو جھجک پھر کیسی
بات کرنا ہی جو ٹھہری تو سرِدار سہی

شوق کامل ہے تو پھر کیسی ہے دیوارِ حجاب
رقص میں عشق ہے رسوا سرِ بازار سہی

معتبر ہم سے بغاوت کی روایت اسرار
اپنا دشمن ہے اگر کوئی تو سو بار سہی





تقدیر کے ہاتھوں میں جو مجبور نہیں ہے
اس شخص سے بڑھ کر کوئی غیّور نہیں ہے

ہے آگ تو مجبور جلا دینے پہ لیکن
انسان تو جل جانے پہ مجبور نہیں ہے

زنجیر کو گر اپنی تو شمشیر بنا لے
لمحہ تری آزادی کا کچھ دور نہیں ہے

آؤ سرِ مقتل یہ لکھیں اپنے لہو سے
اب دورِ غلامی ہمیں منظور نہیں ہے

وہ آنکھ ہی کیا ہے کہ جو محرم نہیں نم ہے
وہ قلب ہی کیا ہے کہ جو رنجور نہیں ہے

اسرار کوئی حکم بدلنے سے ہے معذور
تو حکم عدولی سے تو معذور نہیں ہے



انتباہ

جب خون بہے دریاؤں میں
پر تری زمیں بے رنگ رہے
جب درد بچھا ہو گلیوں میں
تو محوِ رباب و چنگ رہے
جب حشر بپا ہو دنیا میں
تو ساکت بے آہنگ رہے
برپا ہو جنگ آزادی کی
تلوار تری پہ زنگ رہے

جب نام ہوس کا چاہت ہو
معیارِ فضیلت دولت ہو
قانونِ ضرورت رشوت ہو
اسبابِ تجارت مذہب ہو
ایمان روایت ہو جائے
انصاف بغاوت ہو جائے

حق بات حکایت ہو جائے
جب علم جہالت ہو جائے
جب آنکھوں والے اندھے ہوں
جب کانوں والے بہرے ہوں
جب فکر و عمل کی راہوں پر
تقلید کے اندھے پہرے ہوں
جب علم و ہنر کے آنگن میں
سب بنجر موسم ٹھہرے ہوں
جب امن کا سورج کھو جائے
جب ظلم کے بادل گہرے ہوں

جھوٹوں کے سوا سب جھوٹے ہوں
سچوں کے سوا سب سچے ہوں
ہوں انساں بدتر حیواں سے
شہروں سے جنگل اچھے ہوں

اوروں کے جو گھر تعمیر کریں
وہ فٹ پاتھوں پر بستے ہوں
ہوں آنگن جو مزدوروں کے
اوروں کے لئے وہ رستے ہوں
جو سب کا رزق کریں پیدا
وہ رزق کو آپ ترستے ہوں
معصوم کسانوں کے آنسو
جب نانِ جویں سے سستے ہوں

ہو وقعت سونے چاندی کی
انساں بے وقعت ہو جائے
ہو اپنا پیٹ بھرا لیکن
ہمسایہ بھوکا سو جائے
جب ایسی ساعت آتی ہے
دم بھر میں صدی لُٹ جاتی ہے



طبقات کی تفریق زمانے سے مٹا دو
انسان کو انسان سے آزاد کرا دو

اب حرّیتِ فکروعمل کا ہے زمانہ
فرسودہ روایات کو مٹی میں ملا دو

کہہ دو انہیں پلکوں پہ رعایا کو بٹھائیں
شاہوں کو شہنشاہی کے آداب سکھا دو

اب حرفِ ''قُل العفوَ'' کی آتی ہے حکومت
اب دار پہ سرمایہ پرستی کو چڑھا دو

بے چارے مسلمان کا دم گُھٹنے لگا ہے
اسلام کو ملّا کے شکنجے سے چھڑا دو



دھرتی کے نام

رچی بسی مری مٹی میں وہ محبت ہو
کہ خار کی بھی یہاں پھول سی طبیعت ہو
ہر ایک دل کو کرے علم کی ندی سیراب
ہر ایک ذہن کی گاگر ہو روشنی سے بھری
بصارتوں میں ہو آباد آگہی کا جمال
بصیرتوں میں بسیرا کرے قلم کی پری
ہر ایک خواب ہو فکر و نظر کا گہوارہ
ہر اک خیال ہو تہذیب و فن کا شہ پارہ
ہر اک نگاہ میں چمکے سحر محبت کی
ہر ایک دل کے افق پر وفا کی لالی ہو
نہ کوئی دن ہو تہی دست تتلیوں سے یہاں
نہ کوئی رات یہاں جگنوؤں سے خالی ہو

خدا کرے کوئی منظر بھی سوگوار نہ ہو
یہاں پہ آنکھ کسی کی بھی اشکبار نہ ہو
ہر ایک دن مری دھرتی پہ عید کا دن ہو
ہر ایک رات خدایا ہو چاند رات یہاں
ہر ایک لہجہ یہاں ہو بہار کا لہجہ
ہر ایک بات ہو آئینِ نو کی بات یہاں



راولا کوٹ

وہ جاناں کے آنچل میں بھی ہیں کہاں
یہاں فصلِ گل میں ہیں جو شوخیاں
تھی جس سے ہے عنبریں زلف بھی
وہ خوشبو یہاں شام میں ہے جواں
جو زیبا رُخوں میں بھی دیکھے نہیں
وہ جلوے یہاں صبح میں ہیں عیاں
جو شیریں لبوں میں بھی ناپید ہیں
یہاں ہیں پھلوں میں وہ شیرینیاں
اُمنگیں یہاں ایسے اُڑتی پھریں
سرِ شاخِ گل جس طرح تتلیاں
کچھ ایسے یہاں مسکرائے سحر
کہ ہو اوس پر موتیوں کا گماں
شبیں جون کی بھی ٹھٹھرنے لگیں
گھڑی بھر جو برسے یہاں آسماں

عجب لائیں روئیدگی بارشیں
اُگے پتھروں سے بھی سبزہ یہاں
یہاں کی دھنک رنگیاں اوڑھ کر
ہوا سے کریں پھول سرگوشیاں
بہشتِ بریں جیسی خوش رنگ ہیں
مرے راولاکوٹ کی وادیاں



شاردا

چپ چاپ احتراماً بہتا جہاں ہے نیلم
دوشیزہ پتھروں کی خوابیدہ سی پہاڑی
ہم زاد ناردا کی سُرگن کی وہ سہیلی
ہم دم ہمالیہ کی دَیَودار کی پہیلی
تہذیب کی وراثت علم و قلم کی دیوی
اپنے قدیم گھر کا اک یادگار آنگن
اپنے ملول من کی اک خوشگوار دھڑکن
خوش رنگ تتلیوں کی جاگیر شاردا ہے
گل پوش راستوں کی تقدیر شاردا ہے
میرا کلام میری تہذیب میری مٹی
میں شاردا ہوں شاید کشمیر شاردا ہے





اشتہار

شاردا نام کی کوئی دیوی
ہے کہیں تو اُسے خبر کر دو
اُسکی فوری کہیں ضرورت ہے
شاردا کے قدیم باسی کو
شاردا کی زمیں ضرورت ہے





نارسائی سے رسائی کا بھرم ہے اسرار
خواب ہیں کچھ تو خیالات بھی ہوتے ہوں گے





تجھ کو میں تو نہ فراموش کبھی کر پایا
میں بھی کیا میرے خدا تجھ کو کبھی یاد آیا

میری اک بھول پہ اے مجھ کو بھلانے والے
آج بھی تیری محبت ہے مرا سرمایا

دونوں عالم میں مرے عکس کی تصویریں ہیں
تیری چاہت نے بہت دور مجھے پہنچایا

مجھ سے چھپ کر مرے احساس میں رہنے والے
تو نے رہ رہ کے مجھے اپنے لئے ترسایا

صبح تک اشک جمے رہ گئے آنکھوں میں مری
رات نے آتشِ غم کو تو بہت بھڑکایا

چاہے جنت بھی ملے مجھ کو نہ آئے گا قرار
ایک انساں کو بھی دوزخ نے اگر جھلسایا





اے خدا صرف یہ بتا دے مجھے
کہ تجھے کیا ملا بُھلا کے مجھے

موت لکھ کر مرے مقدّر میں
کر دیا زیست کے حوالے مجھے

اب وہ میرا حساب رکھتے ہیں
پوجتے تھے کبھی فرشتے مجھے

لوٹ جاتی ہے جب بھی آتی ہے
ہے شکایت یہی سحر سے مجھے

یا مجھے تُو بھی یاد کرتا رہے
یا تری یاد بھی نہ آئے مجھے

خود پہ ہو جاؤں میں فدا اسرار
اسقدر بھی نہ کوئی چاہے مجھے





میرے آگے کسی بشر کو کہیں
دست بستہ کھڑا نہ کر دینا
کوئی کمتر مجھے نظر آئے
مجھ کو اتنا بڑا نہ کر دینا



نیا سورج

جو بہہ رہا ہے لہو اور جو بہنے والا ہے
اسی سے حرّیتِ جاں کا بول بالا ہے
نہ اب ہماری نگاہوں پہ ہے کوئی پردہ
نہ اب ہماری زبانوں پہ کوئی تالا ہے
کہو کہ دورِ غلامی ہمیں قبول نہیں
کہو کہ رات کی مانند دن بھی کالا ہے
دکھائی دیتا ہے اب صاف صاف ہر منظر
وہ دیکھو شب کے پرے روشنی کا ہالہ ہے
طویل ہی سہی لیکن شبِ طویل کے بعد
وہ آفتاب جسے وقت نے اچھالا ہے
جسے لہو کی مسلسل شفق نے پالا ہے
وہ جس کے بعد ہزاروں برس اجالا ہے
مری اداس زمیں پر چمکنے والا ہے



(پاکستانی وکلاء کی تحریک پر)



مری نظر کو مرے دل کا پاسباں کر دے
مری زباں کو مرے دل کا ترجماں کر دے

خدایا رنگ میں اب اپنے رنگ لے مجھکو
تو اپنا حسن عمل میں مرے عیاں کر دے

ترے خیال ہوں آباد میرے خوابوں میں
مری نگاہ کی وسعت کو بے کراں کر دے

زمیں کی تہہ سے ہو لاہوت تک سفر میرا
اسیرِ ذات نہ رکھ مجھ کو لامکاں کر دے

خدایا پھیل رہے ہیں جو دشت تھام انہیں
رُکے ہوئے ہیں جو دریاں انہیں رواں کر دے





خدایا دیدۂ بینا کو بیکرانی دے
تُو میرے سوزِتمنا کو جاودانی دے

ترے فلک پہ ستارے ترے رہیں روشن
جو دل کی شب ہے اُسے بھی تو ضوفشانی دے

خزاں رسیدہ ہیں جو لوگ ایک مدت سے
وہ کھل اٹھیں تو مجھے بھی رُتیں سہانی دے

تو میری موت پہ رکھ اپنا اختیار مگر
میں خود جیوں جسے مجھ کو وہ زندگانی دے

وہ شادماں ہی سہی میرے درد سے یا رب
کسی کے درد سے مجھ کو نہ شادمانی دے





خاتم بالخیر

کر رہی ہے گُلوں سے تری گفتگو
کر کے بادِصبا خوشبوؤں سے وضو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو
تتلیوں کو تری دید کی آرزو
فصلِ گل کو ترے لمس کی جستجو
اک کلی کے تبسم کی تکمیل پر
زندگی لگ رہی ہے قضا ہو بہو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

تیری رحمت کے گل ہیں چمن در چمن
روشنی تیری چاہت کی ہے چار سو
تیری توصیف میں جھومتے ہیں شجر
ذکر جاری ترا جا بجا کوبکو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو
چاند تارے ترے نور کے سلسلے
رقص میں آبشاروں کے بس تو ہی تو
روح کی رنگتیں روبرو آ گئیں
آنکھ سے جس نے جب بھی بہایا لہو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو